# وحدتِ فکرِ انسانی

**مولانا محمد خان شیرانی**

چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل


انسان مادہ، نسل اور فکر کے اعتبار سے ایک ہے۔ ضرورت توجہ دلانے، یاد دہانی کرانے اور رہنمائی ونگرانی کی ہے جس کو سیاست بھی کہتے ہیں۔

۱- سب مانتے ہیں کہ مٹی اور پانی کا گارا انسانی تخلیق کا اولین مادہ ہے۔

۲- اور انسانی نسل کی ابتداء ایک مرد اور ایک عورت سے ہوئی ہے۔ تاریخی دستاویزات اور الہامی کتابوں میں ان دونوں کو آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

۳- ہر ایجاد کے بارے میں پانچ باتوں کی رہنمائی اس کے موجد سے لی جایا کرتی ہے۔ (۱) ظاہری شکل، (۲) اندرونی ساخت، (۳) متحرک رکھنے کا ایندھن، (۴) ایجاد کی افادیت (۵) ایجاد کا طریقہ استعمال۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موجد اپنی ایجاد کے ساتھ گائیڈ بک یعنی ہدایات پر مشتمل کتاب دینا ضروری سمجھتا ہے اور ہر ایجاد کے ابتدائی ایام میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ موجد کی نگرانی میں تربیت یافتہ انجینئر بھی ساتھ ہوتا کہ موقع پر ہدایات کے مطابق عمل کر کے دکھائے۔ لہٰذا ہدایات کے مجموعہ سے سمجھانا ہے اور تربیت یافتہ انجینئر کے ذریعے سے عملی میدان میں ہدایات پر عمل کر کے دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس پورے عمل میں سے موجد کو کوئی ذاتی فائدہ اور غرض نہیں ہوتی، سوائے اس خیر خواہی کے کہ اس کی ایجاد دوران استعمال محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ گاہک کے لیے مفید بھی ہو۔ جب ورکشاپ اور میکینک پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر انجینئر کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن گائیڈ بک پھر بھی ساتھ رہتی ہے۔

۴- اگر کوئی اپنی ذاتی ملکیت کے مادہ سے اپنے ہاتھ وکسب سے کوئی چیز ایجاد کرے تو یہ ایجاد کردہ چیز اس کی ذاتی ملکیت ہی قرار پاتی ہے کوئی دوسرا اس چیز کی ملکیت کا نہ دعویٰ کر سکتا ہے نہ ہی یہ دعویٰ قابل سماعت ہے۔

۵- احسان: اچھائی کا بدلہ احسان اور اچھائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مسلّم ہے کہ اچھائی کا بدلہ اچھائی ہی ہے۔ برائی اچھائی کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔

۶- امانت حقدار اور مالک کو پہنچانا ہر ایک کی ذمہ داری اور فریضہ ہے اور کوتاہی خیانت اور جرم ہے۔

۷- روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سودے کو خرید و فروخت اور بیع و شرا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہاتھ میں موجود نقد سرمایہ میں منافع کی غرض سے تصرف کرنے کو تجارت کہتے ہیں۔ ہر سوداگر کو خسارے کے سودا سے بچنے کی شدید خواہش اور طلب ہوتی ہے۔

۸- ہر مسافر جب سفر کی نیت سے حرکت کرتا ہے، اس نے تین امور کا تعین پہلے سے کیا ہوا ہوتا ہے۔ (۱) منزل کا، کہ جانا کہاں ہے۔ (۲) مقصد کا، کہ یہ سفر کس غرض سے ہے۔ (۳) راستے کا، کہ یہ سفر کس راستے سے کرنا ہے۔

اگر کسی مسافر کو اپنے سفر کی نہ منزل کا پتہ ہو، نہ مقصد کا پتہ ہو اور نہ راستے کا، تو اس کو کوئی دانا نہیں کہے گا بلکہ دیوانہ کہے گا۔

۹- کسی بھی حکومت کی حاکمیت کے دائرے کے اندر رہنے کی صورت میں حفاظت کا واحد راستہ یہ ہے (۱) کہ حکومت کو تسلیم کیا جائے۔ (۲) حکومتی شعائر، یعنی آئین، جھنڈا اور افسر وغیرہ کا احترام کیا جائے۔ (۳) اپنی روش کو قانون کے دائرے میں رکھا جائے۔ بصورت دیگر تینوں میں سے کسی ایک یا سب میں کوتاہی بغاوت اور جرم شمار ہوتا ہے۔ ارتکاب جرم کے باوجود حفاظت مقصود ہو تو راستہ حکومتی سرحدات سے نکل کر ہجرت کرنا اور کسی اور ملک وحکومت میں پناہ لینا ہے ورنہ اس کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

۱۰- انسان جب نابالغ بچہ ہو، یا بالغ دیوانہ ہو تو اس کی کوئی مسؤلیت و مکلفیت نہیں ہوتی، نہ اس کا کوئی قول وعمل جرم کہلاتا ہے اور نہ ہی اس کے کسی قول وفعل کی کوئی سزا ہے۔ البتہ بچے کی تعلیم وتربیت اور دیوانے کے علاج و معالجہ اور ضرر سے بچاؤ کے لیے موزوں اور مناسب حال طور طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

۱۱- جب انسان عقل رکھتا ہو اور بالغ بھی ہو جائے تو وہ مسئول اور مکلف

قرار پاتا ہے یعنی اس پر ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں اور کوتاہیاں جرائم شمار کی جاتی ہیں اور محفوظ و مفید معاشرے کے لیے جرائم کی بعض سزائیں مخصوص اور بعض عدالتی صوابدید پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔

۱۲- لہٰذا عقل کے ہوتے ہوئے بلوغ کے بعد ہر انسان کا اولین فریضہ فرائض اور جرائم کے درمیان تمیز ہے اور یہ جاننا ہے کہ میری زندگی کے روشن اور تاریک پہلو کیا کیا ہیں؟ میری زندگی کا کونسا پہلو روشن، خوبصورت ''حسین'' ہے اور کونسا بدصورت ''قبیح'' ہے۔ شناخت و تمیز کا یہی عمل علم ہے۔ تو ہر انسان کا عقل و بلوغ کے بعد اولین فریضہ علم ہے۔

۱۳- کائنات میں سے ہر انسان کی قریب ترین شے اپنی ذات ہے اور محبوب ترین چیز اپنی ذات اور اس کی حفاظت ہے۔ اور علوم میں سے آسان ترین علم یہ ہے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ ''میں ہوں'' اس علم میں نہ انسانی کسب کا دخل ہے اور نہ حس کا۔ بلکہ ہر انسان کی ذات ہی اس علم کے لیے کافی ہے۔

۱۴- انسان کو اپنے فرائض اور جرائم میں تمیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو پہچانے اور اپنی حیثیت کا تعین کرے تاکہ اس حیثیت کی بنیاد پر اس کے فرائض اور جرائم کی تشخیص کی جا سکے۔

۱۵- اب اگر انسان اپنی ذات کی حیثیت کی شناخت اس علم سے شروع کرے کہ میں ہوں تو اس کے دل و دماغ پر وارد ہو گا کہ ایک زمانہ تو ایسا بھی گزرا ہے کہ میں نہیں تھا اور ایک اور زمانہ ایسا آئے گا کہ میں نہیں ہوں گا۔ تو یہ ہستی مجھے کہاں سے ملی؟ اس سوال کے جواب متعدد ہو سکتے ہیں۔

(۱) میں از خود وجود میں آیا ہوں۔ اس جواب کے لیے کوئی معقول اور مدلل وجہ نہ اب تک کسی نے بیان کی ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی بیان کر سکے گا۔ اس لیے کہ اگر انسان کی ذات اس کے وجود کے لیے کافی ہے تو ماضی میں معدوم کیوں تھا؟ اور مستقبل میں اسکی ہستی غائب اور کیوں ہو جاتی ہے؟

(۲) یہ کہ میری ذات سے باہر کوئی ہے جس نے مجھے عدم سے نکال کر وجود بخشا، نیست سے ہست کیا۔ اس تصور کے بعد مزید سوالات انسان کے دل و دماغ پر وارد ہوں گے۔

(أ) کیا میرے موجد، خالق نے مجھے کسی حکمت، افادیت اور مقصد کے تابع نہیں بلکہ بغیر حکمت، بے مقصد اور بغیر کسی افادیت کے لہو و لعب کے طور پر پیدا کیا ہے۔ یعنی میرے خالق نے اپنی صلاحیتوں کو حکمت بھری بامقصد اور مفید مشاغل سے ہٹا کر صرف وقت گزاری کی خاطر میرے وجود جیسے عبث کام میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا ہے؟

جواب ہوگا: نہیں۔ یہ انداز فکر نامعقول اور ایجاد کے بارے میں انسانی مسلمات کے خلاف ہے۔

(ب) کیا میرے خالق نے مجھے حکمت سے بامقصد اور مفید مخلوق کے طور پر عدم سے نکال کر وجود دیا تو ہے مگر رہنمائی کے لیے ہدایات نہیں دی ہیں اور نہ ہی عملی میدان میں نمونہ دکھانے اور نگرانی کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد مقرر کیے ہیں؟

جواب ہوگا: نہیں۔ یہ انداز فکر انسانی مسلمات کے خلاف ہے۔ ہر موجد اپنی ایجاد کو محفوظ اور مفید بنانے کے لیے ہدایات کا مجموعہ دیتا ہے اور اپنی نگرانی میں تربیت یافتہ انجینئر کے ذریعے عمل کے میدان میں دکھانا اور نگرانی کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ ورنہ بصورت دیگر اس کی ایجاد نہ محفوظ رہے گی اور نہ ہی مفید رہے گی۔ انسانی زندگی بھی مادہ اور روح کا مجموعہ ہے اگر خالق کی جانب سے ہدایات کے ذریعے رہنمائی نہ ہو اور تربیت یافتہ افراد کی وساطت سے نمونہ نہ دکھایا جائے اور نگرانی نہ کی جائے تو انسان کو زندہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن انسان نہیں۔ اور نہ ہی زندگی انسانی زندگی کہلائی جائیگی۔

مادہ اور روح انسانی زندگی کے لیے کپڑے کے تانے اور بانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ صرف تانا یا صرف بانا کپڑا نہیں کہلاتا اور نہ ہی مفید ہوتا ہے اسی طرح اگر انسان صرف مادہ پر توجہ دے اور روح کا انکار کرے یا نظر انداز کرے، یا صرف روح پر توجہ دے اور مادہ کا انکار کرے یا نظر انداز کرے، تو یہ نہ انسانی زندگی کہلائی جائے گی اور نہ ہی مفید ہوگی۔ اور دونوں کو اعتدال و توازن کے ساتھ صراط مستقیم پر برتنے کے لیے موجد/ خالق کی ہدایات اور تربیت شدہ افراد کے نمونہ پر عمل پیرا ہو کر ان کی نگرانی میں مفید انسانی زندگی بنائی جاسکتی ہے۔

(ج) کیا میرے موجد/ خالق کی جانب سے رہنمائی کے لئے ہدایات اور تربیت کے لئے نمونہ دکھانے اور نگرانی کرنے کے تربیت شدہ افراد مقرر ہوئے ہیں؟

مسجد صلاح الدین کا اندرونی حصہ

جواب ہاں میں ہے۔
موجد/ خالقِ انسان و کائنات نے ایجاد کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اپنی ایجاد/ مخلوق/ انسان کی ہدایت اپنے ذمہ لی ہے اور یہ ذمہ داری الہامی کتابوں کے ذریعے سے پوری کی ہے اور اپنے تربیت یافتہ انبیاء و رسل کی سیرت و سنت سے ہدایات کے مطابق تشکیل زندگی کا عملی نمونہ دکھایا ہے۔ اور ہر نبی و رسول نے اپنی زندگی میں قوم و امت کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ نگرانی کا عمل بھی جاری رکھا۔ نبوت کا سلسلہ بند ہونے کے بعد، گویا کہ انجینئر بھیجنے کا عمل بند کرنے کے بعد، اب وہ ذمہ داری مکینک، یعنی امامت کے ذریعے سے جاری رہنی چاہئے۔

۱۶- اپنی تخلیق/ ایجاد پر غور و فکر کے بعد اس کی نظر اپنی جسد خاکی پر پڑے گی اور سوچے گا کہ جس مادہ اور جس ہاتھ کے کسب سے میرا یہ جسد خاکی بنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں خود معدوم تھا۔ تو حالت عدم میں میری ملکیت اور میرے اپنے ہاتھ کے کسب کا تو تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوا کہ میری ذات سے باہر کوئی ذات ہے جس کا میرے جسد کے پاس یہ مادہ ملکیت ہے۔ اور میری ذات سے باہر کوئی ذات ہے جس کے کسب سے میرا یہ جسد اس مادے سے بنا ہے۔ یہ دو نہیں ہو سکتے ورنہ فساد ہی فساد ہوتا۔ ایک مادہ نہ دیتا، تو دوسرا کسب نہ کرتا۔ بلکہ مادہ اور کسب دونوں ایک ہی ذات کے ہیں۔ لہٰذا وہ انسانوں میں مسلمہ اصل کے تابع یقین کرے گا کہ میں اپنے آپ کا خود مالک نہیں ہوں، بلکہ میں اس مالک کا مال ہوں، جس کے مادے اور کسب سے میں بنا ہوں۔ اور مال جب انسان ہو تو غلام کہلاتا ہے۔ غلام کی حفاظت اپنے آقا کی تعظیم و اطاعت میں ہے۔ اگر غلام نے اپنے آقا کی تعظیم یا اطاعت میں کوتاہی کی یا کسی دوسرے کو آقا کا ہمسر ٹھہرایا، تو جب آقا اپنے غلام پر سزا کا ہاتھ اٹھائے تو بچانے والا کوئی نہیں۔
اور اگر مال انسان کے بغیر ہے، تو حفاظت کا واحد راستہ یہ ہے کہ مال اپنے مالک کے در پر رہے اور مالک کے زیرِ نظر رہے۔ اگر مالک کے در سے بدک گیا اور نظر سے اوجھل ہوا۔ تو حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں۔ بلکہ چور یا بھیڑیئے کا شکار ہوگا۔ لہٰذا ملکیت کی صورت میں اپنی حفاظت کی خاطر انسان کو اپنے آقا اور مالک کی طلب اور تلاش ہوگی تاکہ یہ معلوم کرسکے کہ کون ہے؟ اس کا در کونسا ہے؟ زیرِ نظر رہنے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ اس کی تعظیم و اطاعت میں رہنے اور کوتاہی اور ہمسر سے بچنے کے لئے کس طرز عمل کی زندگی کو اختیار کرنا پڑے گا؟ ان سب کا جواب وحی کے ذریعہ سے نازل شدہ الہامی ہدایات کے مجموعوں اور انبیاء و رسل کی سیرت و سنت سے ملے گا۔

۱۷- اس کے بعد انسان اپنی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہوگا۔ یعنی دل و دماغ میں سوچنے اور سمجھنے کی، کانوں میں سننے کی، آنکھوں میں دیکھنے کی، زبان میں بولنے کی، ہاتھ میں پکڑنے کی اور پاؤں میں چلنے کی...... وغیرہ وغیرہ۔

اگر وہ ان صلاحیتوں کو اس لئے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے کہ فیصلہ تو میں خود اپنے آزاد اختیار و مرضی سے کرتا ہوں۔ چاہے چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کا ہو، یا انسانی خدمت اور خیرخواہی کا ہو۔ اپنے اس فیصلے کو رو بہ عمل لانے کے لئے میں ان صلاحیتوں کو بغیر کسی روک ٹوک کے استعمال کرتا ہوں۔ تو اگر میں اپنی ذاتی ملکیت کو اپنی ذاتی خواہش میں کسی سے پوچھے بغیر استعمال کروں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ ایسی صورت میں اس کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ذاتی ملکیت یا تو وہ ہے جس کی انسان نے قیمت ادا کی ہو یا محنت سے حاصل کی گئی ہو۔ اور اگر نہ قیمت ادا کی ہو اور نہ محنت کا نتیجہ ہو، پھر تو کسی نے احسان کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان کو ذاتی صلاحیتیں نہ قیمت کے بدلے اور نہ محنت کے نتیجے میں ملی ہیں۔ تو یقین کرے گا کہ یہ صلاحیتیں مجھے کسی سے احسان کے طور پر ملی ہیں۔ اور مسلمہ اصل ہے کہ احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ اب محسن کون ہے؟ اس کے احسان کا بدلہ احسان سے کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ صلاحیتوں کے استعمال کا وہ کونسا طریقہ ہے کہ محسن کی احسان فراموشی اور ناشکری سے بچا جاسکے، اور احسان کا بدلہ احسان سے دیا جا سکے؟ ان تمام سوالوں کا جواب وحی اور نبوت و امامت میں ہے۔

۱۸- انہی صلاحیتوں پر اگر دوسرے طریقے سے غور کیا جائے کہ اگر ان صلاحیتوں میں کوئی ایک یا سب مجھ سے واپس لی جائیں تو میں بچا نہیں سکتا۔ تو یقین کرے گا کہ میری ذات سے باہر کوئی ہے جن کی یہ

امانتیں میرے پاس ہیں۔ امانت کا مالک جب چاہے جس طرح چاہے اپنی امانت اٹھالے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ اس صورت میں ایک معقول اور محتاط انسان کی خواہش ہوگی کہ معلوم کر لے کہ ان امانات کا مالک کون ہے؟ تاکہ مسلمہ اصل کے مطابق اس کی امانت کو اس تک پہنچایا جائے اورخیانت کے جرم سے بچاجائے۔ یہ رہنمائی بھی وحی اور نبوت و امامت سے ملے گی۔

۱۹- اور اگر زندگی کی روش میں ان صلاحیتوں کے استعمال پر غور کرے۔ مثلاً کسی چیز پر نظر جما کر دیکھا جائے، تو دیکھنے کے اس عمل میں انسان کی جانب سے دیکھنے کی صلاحیت صرف ہوئی مگر اس کے بدلے میں اس چیز کی شناخت اور پہچان حاصل ہوئی۔ گویا بینائی کی صلاحیت اور اس چیز کی شناخت کے درمیان باہمی مبادلہ ہوا۔ انسان کی جانب سے بینائی کی صلاحیت استعمال ہوئی اور باہر سے اس چیز کی شناخت اس کو حاصل ہوئی۔ اور باہمی مبادلے کے اس عمل کو سودا، خرید وفروخت اور بیع وشرا کہتے ہیں۔ لہٰذا صلاحیت اور مالی وسیلے کا ضرورت کے مطابق الگ الگ استعمال کو سودا، خرید وفروخت، بیع وشرا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن اگر عمومی طور پر دیکھا جائے کہ ہر انسان کے ساتھ اس کے ہاتھ میں دو چیزوں کا نقد سرمایہ موجود ہے، جان اور مال کا۔ اور وہ اس نقد سرمایے میں منافع کی غرض سے تصرف کرتا ہے تو یہ تجارت ہے۔ معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کی روش روز مرہ کی ضرورتیں پوری کرنے کی صورت میں بیع وشرا اور منافع کمانے کی صورت میں تجارت ہے۔ ہر خرید وفروخت والے اور ہر تاجر کو خسارے کے سودا سے بچنے کی شدید طلب اور خواہش ہوتی ہے، کسی کو نہ خسارے کا سودا پسند ہے، اور نہ ہی یہ پسند ہے کہ میری کمائی میرا ساتھ چھوڑ کر میرے ہاتھ اور ملکیت سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ اور ملکیت میں چلی جائے۔ انسانی زندگی کے اس سودا اور تجارت میں مذکورہ نقائص سے بچنے کا طریقہ اور روش کیا ہوسکتی ہے؟ ہر معقول اور حفاظت کے بارے میں فکر مند انسان کا اس بارے میں حتی المقدور شدید طلب اور تلاش ہوگی، اس کا یہ مطلوب وحی، نبوت اور امامت میں ملے گا۔

۲۰- اور اگر انسان مرور زمانہ پر غور کرے کہ شب وروز گذرتے ہیں، اور ان کا یہ گذر انسان کو اپنے اس موجود مسکن اور دنیا سے دور کرتا جاتا ہے اور اگلی منزل اور مسکن کے قریب کرتا جاتا ہے، تو یقین کرے گا کہ میری زندگی کی یہ روش سفر ہے۔ اس یقین کے بعد ہر معقول انسان مسلمہ انسانی اصل کے مطابق اپنے اس سفر کی منزل، مقصد اور راستے کی تلاش میں ہوگا۔ اس تلاش وجستجو میں رہنمائی وحی اور نبوت سے لی جاسکتی ہے۔

۲۱- کائنات کے جس حصے میں انسان کا مسکن ہے، اس میں مسلسل، مربوط اور منظّم تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ شب وروز بدلتے ہیں، مختلف موسم ایک دوسرے کے بعد پے در پے آتے رہتے ہیں، بادل آتے جاتے ہیں، بارشیں برستی ہیں، فصلیں اگتی اور پکتی ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ ایک بااختیار مالک، مقتدر حاکم، مستحکم نظام حکومت، ثابت اور غیر متبدل اصول وقانون کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ کائنات کے نظم وربط پر غور کے نتیجے میں انسان ایک طاقتور حاکم کی حکومت کی سرحدات کے اندر اپنے آپ کو پائے گا۔ ایسی صورت میں حفاظت کا واحد راستہ حاکم کی حاکمیت کو تسلیم کرنا، حکومت کے شعائر کا احترام کرنا اور اپنی روش کو حکومتی اصول، قانون وضوابط کے تابع رکھنا ہے۔ بصورت دیگر بغاوت وجرائم کا ارتکاب ہوگا۔ پھر بھی اگر حفاظت مطلوب ہو تو راستہ حکومتی سرحدات سے نکل کر ہجرت کرنا ہے۔ جبکہ انسان آسمان وزمین کی سرحدات سے نکل کر ہجرت کرنے میں بے بس ہے۔ تو جب حکومت سے ہجرت کرنے میں بے بس ہو اور حکومتی سرحدات کے اندر رہنے کی مجبوری ہو اور بغاوت وارتکاب جرائم کی عادت بنائی جائے اور ان سب کچھ کے باوجود اپنی حفاظت کا شوق رکھے...... کیا یہ ممکن ہے؟ 'ایں خیال است ومحال است وجنوں'۔ اب اپنی حفاظت کے بارے میں متفکر انسان کو اس کائنات کے مالک کی تلاش ہوگی، جس کائنات سے اس کی زندگی کی ضرورتیں اور سہولتیں وابستہ ہیں۔ کائنات کے حاکم، اس کی حکومت کے شعائر اور حکومتی نظام وقانون کی تلاش ہوگی۔ جس کائنات میں اس کا مسکن اور زندگی کا گذر بسر ہے، تاکہ اپنی حفاظت وسہولت کی خاطر بغاوت وارتکاب جرائم سے بچا رہے۔

۲۲- معلوم ہوا کہ خالق/ موجدِ کائنات وانسان نے وحی اور نبوت کے ذریعے سے انسانی مطلوب اور رہنمائی کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ وحی کی رہنمائی اور انبیاء کی سیرت وسنت کی تقلید اور انبیاء کی زندگی میں ان کی نگرانی میں، اور نبی کی رحلت کے بعد اور نبوت کے خاتمے کے بعد ہر نبی کی شریعت کے باعمل علماء، ائمہ کی تقلید ونگرانی میں زندگی گذارنے سے فائدہ خود انسان کو ہے۔ اس کی زندگی محفوظ، باوقار اور مفید رہے گی، اور انسانی زندگی کہلائے گی۔ خالق اور رہبر کو چاہے نبی کی صورت میں ہو یا امام کے، کسی بھی انسان کی اطاعت کا فائدہ اور بغاوت کا نقصان نہیں ہوتا۔ نفع ونقصان ہر انسان کا اپنا ہے۔ لہٰذا وحی کے ذریعے سے رہنمائی انسانی ضرورت ہے، اور ایجاد کے حوالے سے، خیرخواہی کی بناء پر، موجد/ خالق کا خود اپنے ذمے لیا ہوا فریضہ ہے تاکہ انسانی معاشروں اور جوامع میں معروف ومسلّم امور، اقدار،

فرائض وجرائم اور حدود زندگی کی یاددہانی ''تذکیر'' کرائی جائے۔ نہ یہ کہ خودغرضی سے ذاتی تسلط کیلئے غیر معروف ومسلّم امور وفرائض انسانوں پرتھونپ دیئے جائیں۔

۲۳- دنیا جہاں کے انسانوں کی غالب اکثریت دینی، شرعی اور مذہبی عقیدے کے طور پر دل وجاں سے قول وعمل کے میدان میں کسی نہ کسی رہبر کی ذات وشخصیت کو محترم اور اس کی تعلیمات کے مخصوص مجموعے (کتاب/صحیفہ) کو اپنے لیے ہدایات کا متبرک مجموعہ، اور اس کے ذاتی کردار (سیرت) اور اس کی عمومی زندگی کی روش (سنت) کو بطورنمونہ، اور کتاب کی روشنی میں رہبر سےنقل شدہ ہدایات واقوال کو بطورمشعل راہ تسلیم کرتی ہے، یاکم ازکم زبانی اقرار اور رسمی اظہار کرتی ہے، یا عمومی طور پر کسی مخصوص رہبر اور اس کی تعلیمات کی جانب منسوب کرکے اُس امت وملت کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ مذہبی نسبت سے عاری انسان آٹے میں نمک میں برابر بھی نہیں ہیں۔ اپنے رہبر کو کوئی خالق کی جانب سے نبی یا رسول کا نام دے یا نہ دے، اور رہبر کی ہدایات کے مجموعے (کتاب/ صحیفے) کو کوئی وحی کے ذریعے سے خالق کی جانب سے نازل شدہ کتاب وصحیفہ تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن تمام شرائع ومذاہب میں دو باتیں مشترک ہیں: (۱) بالائی قوت وقدرت کی تعظیم واطاعت، (۲) کائنات ومخلوق کے ساتھ ہمدردی، محبت، شفقت اور خیرخواہی کی بنیاد پر معاونت۔ انہی دو باتوں کو دین اس لیے کہا جاتا ہے کہ فرائض کی تعیین اور جرائم کی تشخیص انہی دو بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ فرائض کی ادائیگی پر جزا اور جرائم کے ارتکاب پر سزا دینے کی بنیاد بھی یہی دو باتیں ہیں۔ اور یہی دین ہے جوتمام شرائع میں مسلسل چلا آ رہا ہے اورمشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام شرائع ومذاہب میں جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، عداوت (جن کا مجموعہ منافقت ہے)، چوری، ڈاکہ، ناحق قتل، زنا، شراب...... وغیرہ جرائم شمار ہوتے ہیں۔ البتہ شرائع میں فرق دو باتوں میں ہے: عبادت کے طورطریقے اور جرائم کی سزائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۲۴- ہر رہبر نے ان دو رابطوں کو انسانی زندگی میں اتارنے اور روبہ عمل لانے کیلئے اپنی نسلی اکائی (قوم) کو، اس کی فکر پرمتفق لوگوں (امت) کو، اور اس کے راستے کی پیروی میں زندگی کے سفر کو طے کرنے والوں (ملت) کو مناسب حال ہدایات دیں، تعلیم وتربیت دی اور اپنی زندگی کی روش سے نمونہ دکھاتے رہے اور نگرانی کرتے رہے۔ رہبر کے اس عمل کو شریعت کہتے ہیں۔ رہبر کی رحلت کے بعد بعض امتوں نے اپنے رہبر کی تعلیمات میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ شعوری یا غیر شعوری آمیزش کی اور ان کی شرائع اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

۲۵- وحی کی تعلیمات پرمشتمل صحائف کی تعداد سو (۱۰۰) یا ایک سو دس (۱۱۰) بتائی جاتی ہے، اور کتابیں چار ہیں۔ اور اس سلسلے کا آخری ایڈیشن اور انفرادی واجتماعی زندگی میں دین پرعمل کرنے کیلئے مکمل ہدایات کا محفوظ مجموعہ قرآن ہے۔ اور انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزارکم وبیش بتائی جاتی ہے۔ اور نبوت کے سلسلے کی آخری کڑی محمد عربی ﷺ کی نبوت ہے۔ اس کے بعد نبوت کے عمل کو باعمل ماہر علماء وائمہ کی وساطت سے جاری رکھنے کا حکم ہے۔

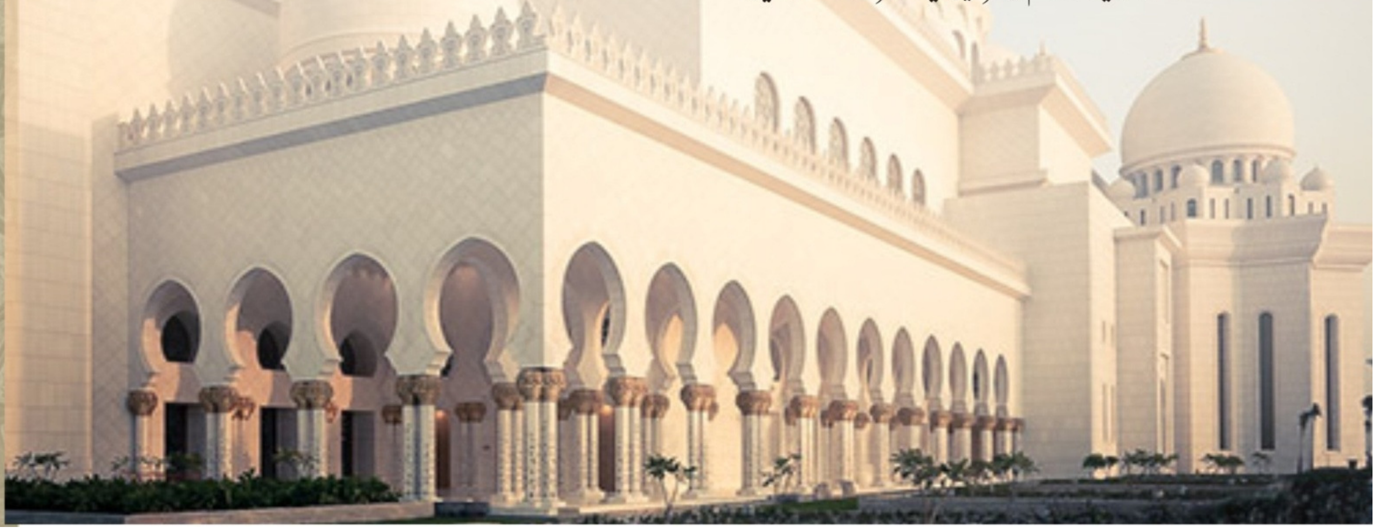

۲۶- انبیاء کے ساتھ معجزات بھی دکھائے گئے، تاکہ نبی اور اس کی قوم کو باور کرایا جائے کہ یہ 'ہدایات' کائنات کے خالق، مالک اور حاکم کی جانب سے ہیں۔ اپنی خلق اور مال میں جس طرح وہ چاہتا ہے تصرف کرتا ہے طبیعت کے فارمولوں (قدروں) کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ اور حاکم مطلق ہونے کے ناطے اپنے وضع کردہ طبعی جبلت اورا انسانوں کیلئے ارسال کردہ شریعت کے اصولوں اور قوانین میں جس طرح چاہے بلا روک ٹوک مناسب حال ترمیم وتبدیلی کرتا ہے۔ معجزات دکھانے کے باوجود قوموں کا اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہنا ان کی مکمل تباہی کا باعث اس لیے بنا کہ وہ الٰہی ہدایات اور انبیاء کی سیرت وسنت کے نمونے سے ہٹ کر اپنی خواہش کی زندگی گذارنے کے باعث اپنی ذات کو اور اپنی ہستی کو تو غیر محفوظ تو پہلے سے بنا چکی تھیں۔ اور خالق، مالک اور حاکم نے اپنی قوت، قدرت ''دلیل'' کے راستے جہاں وحی اور نبوت سے ثابت کیا وہاں عملی میدان میں معجزے دکھانے کے ذریعے سے 'قوت وقدرت' کا مظاہرہ کیا۔ سمجھانے کے دونوں راستے دلیل اور دید، عقل وحس کو استعمال کرنے کے باوجود اُن قوموں کا بضد رہنا ثابت کرتا ہے کہ وہ سمجھنے کی صلاحیت کو بھی اپنے ہاتھوں تباہ وبرباد کر چکے ہیں۔

ان قوموں کی ہستی ان کے اپنے ہاتھوں غیر محفوظ، بے مقصد اور غیر مفید تو پہلے ہی سے تھی اور سمجھانے کے تمام طریقے آزمانے کے باوجود اپنی نادانی پر قائم رہنے سے، راہ راست پر آنے کی امید بھی باقی نہ رہی۔ جب کوئی موجود اپنے وجود کی افادیت اور مقصد کھو بیٹھتا ہے تو اس کا وجود بھی باقی نہیں رہتا اور نہ رہنا چاہیے۔ بالخصوص ''انسان'' اگر صلاح کا حامل نہ ہو تو فساد کا باعث بنے گا اور فساد اور مفسد کا محو کرنا ہی ''صلاح'' کی بنیاد ہے۔ جیسا کہ ''کاشتکار'' اپنی زمین میں مفید فصل کاشت کرنے کیلئے ضروری سمجھتا ہے کہ پہلے زمین فالتو جڑی بوٹیوں اور خس وخاشاک سے پاک وصاف کر دی جائے اور ایک ''باغبان'' اپنے باغ کے درختوں کو ثمر بار بنانے کیلئے درختوں کی شاخ تراشی ضروری سمجھتا ہے۔ اور ایک خیرخواہ معالج اپنے مریض کے بدن میں زہریلے مواد کی سرایت سے حفاظت کیلئے مریض کے بعض اعضاء کو کاٹنا ضروری سمجھتا ہے۔

۲۷- انسان کا بالا قوت وقدرت کی ساتھ رابطے کو الہامی کتابوں میں ''صلوٰۃ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ''صلی'' عربی لغت میں گھڑ دوڑ کے اس دوسرے گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا ماتھا پہلے گھوڑے کے پچھلے حصے سے مس ہوتا ہو۔ یعنی نہ تو وہ پہلے گھوڑے سے آگے نکلے اور نہ ہی پیچھے کٹے۔ یعنی انسان کا رابطہ اپنے خالق، اپنے آقا، مالک، اپنے محسن، اپنے حاکم کے ساتھ کامل تعظیم وکامل اطاعت کا ہوگا۔ نہ آگے بڑھے گا اور نہ پیچھے کٹے گا۔ کبھی کبھار رکوع کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ''رکوع'' جھک جانے کو کہتے ہیں، یعنی انسان اللہ کی حاکمیت کے سامنے اکڑے گا نہیں، بلکہ سر تسلیم خم کرے گا۔ اور ہر قسم کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کیلئے اپنے آپ کو آمادہ ظاہر کرے گا۔ ''سجدہ'' کی اصطلاح و''عمل'' غلامی اور ملکیت کے اظہار اور اعتراف کیلئے ہے۔ انسان ظاہر کرتا ہے کہ مال کا مالک کے سامنے، غلام کا آقا کے سامنے کوئی ہستی اور حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ خاک وراکھ ہے۔

۲۸- انسان کا مخلوق کے ساتھ رابطے کو الہامی کتابوں میں ''زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی محبت، شفقت اور ہمدردی وخیرخواہی کے ساتھ مخلوق کا معاون رہنا، سہارا بننا، پرورش دینا۔ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے دو رابطے دین ہیں۔

۲۹- خالق کی جانب سے ہر نبی کی لائی ہوئی ہدایات اور ان پر عمل کرنے کیلئے اپنی سیرت وسنت سے پیش کردہ نمونہ اُسی نبی کی ''شریعت'' اور ''منہاج'' کہلاتے ہیں۔ شریعت/ منہاج، عربی لغت میں صاف ستھرے، وسیع وعریض، کھلے اور سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔ گویا ہر نبی نے اپنے زمانے اور قوم کیلئے اور آخری نبی ﷺ نے ہمیشہ کیلئے پوری انسانیت کی زندگی کے سفر کو اپنے خالق کے در تک پہنچنے کیلئے جو اس کی زندگی کی آخری منزل ہے، اور اپنے محسن کے دیدار کے حصول کیلئے، جو اس کی زندگی کے سفر کا مقصد ہے، صاف ستھرا، وسیع وعریض کھلا اور سیدھا راستہ بتایا بھی ہے اور دکھایا بھی ہے۔ یعنی شریعت کی مثال پانچ، سات، دس روئیں موٹر وے کی ہے۔

۳۰- ''مذہب'' عربی لغت میں ''کھلے راستے'' یا موٹروے کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس پر کوئی شخص چلتا ہو یا گاڑی چلتی ہو اور سفر طے کرتی ہو۔ اس شخص اور اس گاڑی کے ڈرائیور کیلئے یہ احتیاط تو ضروری ہے کہ راستے سے بھٹکے نہ موٹر وے سے اترے۔ اور ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ''راستے'' موٹروے پر ٹھیک جا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ جو گاڑی یا شخص میری پیروی کرتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے میری لکیر پر چلتا ہوا سفر کرتا ہے، تو وہ اس راستے اور اس موٹر وے پر ہے اور جو میری پیروی نہ کرتے ہوئے، میرے دائیں بائیں یا آگے پیچھے چلتے ہوئے سفر کرتے ہیں وہ راستے سے بھٹکے اور موٹروے سے اترے ہوئے ہیں، معقول بات نہیں ہے۔ کیونکہ نہ ایک شخص وسیع راستے اور نہ ہی ایک گاڑی دس روئیں موٹروے کو گھیر سکتی ہے۔ اور نہ ہی ایسا ہوا ہے کہ وسیع راستے کو ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک گھیر کر اس پر ایک شخص چلتے ہوئے سفر کرے اور نہ ہی اب تک ایسی

گاڑی ایجاد ہوئی ہے کہ موٹروے کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گھیر سکے۔

۳۱- بعینہ کسی نبی کی شریعت کے پیروکار، ماہر باعمل علماء وائمہ کی یہ احتیاط تو ضروری ہے کہ اپنے نبی کی شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں اور اختلاف کی صورت میں شرعی دلائل سے ثابت کرے کہ میری زندگی کے سفر کیلئے میرے نبی کی لائی ہوئی ہدایات اور اس کی سیرت وسنت کے نمونے سے اخذ کردہ مذہب اسی شریعت، شارع، موٹروے کا حصہ ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ کہ اگر کوئی میری اخذ کردہ رائے کی پیروی میں زندگی کے سفر کو میرے پیچھے رہ کر طے نہ کرے تو وہ پوری شریعت سے نکل چکا ہے، شارع اور موٹروے سے بھٹک چکا ہے، معقول بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی نبی کی شریعت کا کوئی بھی عالم نبوت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا کہ معصوم اور واجب الاطاعت ہو۔ زیادہ سے زیادہ مجتہد ہوگا اور مجتہد کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہر مجتہد پر اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے لیکن اپنے اجتہاد کو دوسروں کے سر تھوپنا اس کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا فتویٰ کی نوبت عالم کے اپنے علم پر عمل کے میدان میں نہیں، بلکہ اپنی رائے کو دوسروں پر تحمیل کرنے کے میدان میں آتی ہے۔ جو اس کا حق نہیں ہے۔

۳۲- ہر شریعت کے پیروکاروں کو دو قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے: (۱) کوئی کام یا عمل سرزد ہو، لیکن شریعت میں اس کام کیلئے حکم کی تصریح (نص) موجود نہ ہو۔ تو علماء حکم کی تلاش میں شرعی ہدایات کو کنگھالتے ہیں۔ تلاش کے اس عمل کو استقراء کہتے ہیں۔ نتیجتاً اس کام کیلئے کوئی حکم اس کے دل ودماغ پر وارد ہوتا ہے۔ اس کو ''استنباط'' کہتے ہیں۔ اور عمل وحکم کے درمیان جوڑ پیدا کرنے کے عمل کو ''قیاس'' کہتے ہیں۔ اور اس پورے عمل کو ''اجتہاد'' کہتے ہیں۔ چونکہ ایک اجتہاد کا عمل دوسرے اجتہاد کا راستہ نہیں روکتا، اس لیے کسی عالم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کہے کہ چونکہ اس عمل کے حکم کو معلوم کرنے کیلئے میں لگا ہوں، تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم بھی اس عمل کے حکم کو معلوم کرنے کی سعی کرو۔ تو جیسا کہ اپنے اجتہاد کی تحمیل کا کسی کو حق نہیں ہے، اسی طرح ایک عالم کے اجتہاد کا عمل دوسروں کے اجتہاد کا راستہ نہیں روک سکتا۔ (۲) شریعت کا حکم بالکل واضح اور غیر مبہم ہو، لیکن اس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے، اس کا پتہ نہ چلے۔ ایسی صورت میں حل کا راستہ ''تحری'' ہے۔ کوئی شخص دوسروں کو ''تحری'' سے نہ منع کرسکتا ہے اور نہ اپنی ''تحری'' کو دوسروں پر تھوپنے کا حق وجواز اس کو حاصل ہے۔ مثلاً نماز میں رو بہ قبلہ کھڑے ہونا فرض ہے۔ لیکن اگر آٹھ دس افراد ایسی حالت میں گھر جائیں کہ کسی وجہ سے قبلہ کے رخ کا پتہ نہ چلے۔ ایسی صورت میں ہر ایک کو اپنے فہم ودانش کے مطابق سوجھ بوجھ کر قبلہ رخ کا تعین کرنا ہوگا اور اس کے اپنے متعین کردہ رخ کی جانب نماز پڑھنا اس پر واجب ہے اگر کسی نے اپنی دانست کے مطابق متعین کردہ رخ کو چھوڑ کر دوسرے شخص کی تلاش کردہ رخ کی جانب اپنی نماز پڑھی اور بعد میں پتہ بھی چلے کہ جس جانب نماز پڑھی تھی اُسی جانب قبلہ تھا، تب بھی اس شخص پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ اپنی تحری کا مکلّف تھا، جس پر اس نے عمل نہیں کیا۔ لہٰذا اجتہاد اور تحری نہ راستہ روکتے ہیں، نہ تحمیل کیے جاسکتے ہیں۔

۳۳- سیاست کا بنیادی مادہ ''سوس'' ہے۔ عربی لغت میں سوس طبیعت کو کہتے ہیں۔ خالق طبیعت نے خیرخواہی کی خاطر رہنمائی کا فریضہ اپنے ذمہ لیا ہے جو ''سیاست'' کا بنیادی مقصد ہے۔ طبعی کائنات میں یہ رہنمائی طبعی جبلت کی وساطت سے وحی کرکے پہنچائی بھی ہے۔ اور طبعی جبلت کے ذریعے سے طبعی کائنات کو ''وحی'' کی ہدایات کے مطابق چلایا بھی ہے۔ اور انسانوں کو انبیاء کی وساطت سے وحی کے ذریعے یہ ہدایات پہنچائی بھی ہیں اور انبیاء ہی کی سیرت وسنت سے نمونہ دکھایا بھی ہے۔ لہٰذا ''سیاست'' جو خیرخواہی کی بنیاد پر رہنمائی ہے، کا فریضہ اللہ جل جلالہ نے خود اپنے ذمے لیا ہے۔ اور اس فریضہ کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء'' الخ۔ یعنی بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کیا کرتے تھے۔ نبوت کا مجھ پر ختم ہونے کے باعث میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہونگے۔ یعنی اپنی اپنی قوموں بستیوں اور علاقے کے لوگوں کو بصیرت کی بنیاد پر دلیل سے سمجھائینگے اور اپنے کردار سے شریعت کی ہدایات کے مطابق زندگی گذارنے کا نمونہ دکھائینگے اور پیروکاروں کی شریعت کی روشنی میں زندگی گذارنے کی نگرانی کرینگے۔

۳۴- لہٰذا وحی کے ذریعے سے اللہ جل جلالہ نے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کی توجہ ان کی طبعی جبلت اور نسلی وحدت کی طرف مبذول

کرائی ہے۔ اور فکری انتشار سے بچنے کیلئے انسانیت کے درمیان متفقہ مسلمہ اور معروف اصول اور حدود وقیود کی یاددہانی کرائی یعنی: (۱) ایجاد، (۲) ملکیت، (۳) احسان، (۴) امانت، (۵) تجارت، (۶) سفر، (۷) حاکمیت۔

اور ان بنیادوں پر انسان کی زندگی کے حدود اربعہ، دائرہ کار اور اپنے مدار میں رہتے ہوئے مصروف عمل رہنے کی جانب رہنمائی کی۔ اور فرائض وجرائم کی وضاحت کی۔ اس اعتبار سے وحی ہی سیاست ہے۔ ذمہ اللہ جل جلالہ نے خود لیا ہے اور انبیاء کے ذریعے یہ ذمہ داری پوری کی ہے۔ اور متقی علماء وائمہ کے ذریعے جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ گویا اب سیاست کا فریضہ متقی علماء کا ہے جو امامت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۳۵- متقی کا اصل مادہ ''و- ق- ی'' ہے اس مادے سے بنے ہوئی عربی زبان کے ہر لفظ میں حفاظت اور احتیاط کا مفہوم ملحوظ رہتا ہے۔ لہٰذا متقی کا معنی وہ شخص جو زندگی کے ہر لمحے میں ہر حرکت وہر قسم کی منصوبہ بندی میں، اس کے شر وضرر سے حفاظت کرنے کے بارے میں فکرمند ہونے کے باعث نہایت محتاط رہے، اور پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ اس قسم کا فکرمند اور محتاط شخص جب الٰہی ہدایات کے آخری، کامل اور محفوظ مجموعے ''قرآن'' پر رہنمائی لینے کی غرض سے توجہ دے تو بصیرت کی بنیاد پر دلائل کی روشنی میں ہدایات کے اس مجموعے، نیز تمام سابقہ انبیاء کی لائی ہوئی ہدایات کے مجموعوں کے بارے میں تسلیم کرے گا کہ میرا مطلوب یہاں ملتا ہے۔ اور اس امر کا بھی پوری اطمینان وسکون کے ساتھ یقین، باور اور اعتماد ہوجائیگا کہ میرا خالق، آقا، مالک، رازق، محسن، حافظ اور حاکم یکتا ذات اللہ کی ہے۔ اور محمد عربی ﷺ وہ شخص ہیں جن کی اللہ جل جلالہ نے خود اپنی نگرانی میں تربیت کی اور انہوں نے اللہ جل جلالہ کی ہدایات لے کر انسانوں تک پہنچایا ہے اور ان ہدایات کے مطابق زندگی گذارنے کا نمونہ اپنی سیرت وسنت سے امت کو دکھایا۔ اور الٰہی ہدایات کی روشنی میں امت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر سطح میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ نگرانی بھی کی۔

۳۶- دلائل کی معقولیت کی بنیاد پر اتباع وبغاوت کے نتائج دیکھے بغیر عقلی اطمینان، یقین، باور اور اعتماد کے باعث ہدایات اور نمونے کی عملی زندگی میں اتباع کا قطعی فیصلہ کرنا ''ایمان بالغیب'' کہلایا جاتا ہے، جس کو ایمان عقلی بھی کہا جاسکتا ہے۔ یعنی دلائل کے میدان میں نتائج سامنے آئے بغیر بات کو تسلیم کرنا، مفید ہو تو اس پر عمل کیا جائے، مضر ہو تو اس سے بچا جائے۔ یعنی اعتماد دلیل پر کیا جائے، نتائج سامنے آنے کا انتظار نہ کیا جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں سب کچھ ہوچکا ہوگا۔ فائدہ ہو یا نقصان وضرر۔ عقلی سطح پر سکون ویقین کی بنیاد پر اتباع کے اس قطعی فیصلے کا مقصد یہ ہے کہ صلاحیتوں اور وسائل کا روز مرہ کی ضرورتوں میں استعمال ہو جس کو خرید وفروخت اور بیع وشرا کہتے ہیں۔ یا پھر جان ومال کے نقد سرمائے میں منافع کی غرض سے تصرف ہو جس کو تجارت کہتے ہیں۔ ہر صورت میں سودا اللہ جل جلالہ سے قطعی طور پر طے کیا گیا ہے۔ اس فیصلے کے بعد جان ومال کا مجموعی سرمایہ اور الگ الگ ہر ذاتی صلاحیت اور مالی وسیلہ انسان نے اپنے اختیار سے نکال کر اپنے رب کے حوالے کیا۔ اور اس سودا کی قیمت اللہ کی جانب سے جنت ہے۔ یعنی موجودہ اور آئندہ دونوں جہانوں کی زندگی میں ہر قسم کی ناکامیوں پریشانیوں سے تحفظ اور کامیابیوں سے ہمکنار ہونا یا اگر مختصر زندگی کی پریشانی ہو تو ہو مگر طویل وناتمام زندگی کامیابی وکامرانی کی ہوگی۔

اللہ کی ذات اور نبی کی رسالت پر عقلی اعتبار سے اعتماد اور اندر ہی اندر قطعی فیصلے کے مطابق کئے ہوئے سودا کا اظہار واقرار کلمۂ توحید کو زبان سے ادا کرنے سے کیا جاتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو کہ سودا اللہ سے ہوا ہے اور مثبت یا منفی رواتب وبرتاؤ کی بنیاد بھی اللہ کے ساتھ

کیا ہوا یہ سودا بنے۔ لہٰذا ایمان انسان کی جانب سے اپنی جان ومال کا سودا ہے اللہ کے ساتھ، جس کو بیع کہتے ہیں۔ اور کتاب وسنت کے مطابق زندگی کے اعمال ''تسلیم مبیع'' ہے۔ یعنی فروخت شدہ چیز خریدار کے حوالے کرنا۔ اور جنت اللہ کی جانب سے اس سودا کی قیمت ہے۔تسلیم مبیعہ اگرچہ قیمت کے لازم ہونے کیلئے شرط ہے،مگر عقد بیع میں شامل حصہ نہیں ہے۔ عقد بیع تسلیم مبیع کے بغیر بھی صحیح ہے۔ اگر سودا حوالہ ہوا تو قیمت بھی لازم ہوجائیگی۔یہی وجہ ہے کہ عقائد کے میدان میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ ایمان بسیط ہے، اس کے اجزاء نہیں کئے جاسکتے۔ نہ لمبا ہے نہ چوڑا، نہ بھاری ہے نہ ہلکا ہے، نہ خوبصورت نہ بدصورت ہے۔ ایمان ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ عقد بیع میں یہ باتیں بے معنی ہیں۔

نیز یہ کہ ایمان مجمل ہے۔تفصیلات ایمانیات نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قطعی طور پر نصوص سے ثابت ''اجمال'' ہے۔ مثلاً شرک قبیح ہے، بدعت قبیح ہے۔ اب رہی یہ بات کون کونسے اعمال واقوال شرک یا بدعت کے زمرے میں آتے ہیں اور کون کونسے نہیں آتے، یہ تمام کی تمام تفصیلات ظنی ہیں۔ جو ایمانیات میں شمار نہیں ہوتے۔ جو عالم اپنی شرعی دانست کے مطابق جس قول وفعل کو شرک یا بدعت سمجھ کر پھر بھی وہ یا اس کے پیروکار وہ عمل کرتے ہیں تو اچھا نہیں ہے۔لیکن اسی عمل کو کوئی اور عالم اپنی شرعی دانست کے مطابق شرک وبدعت تو کجا سنت سمجھتا اور کرتا ہے تو اگر اس کے پاس ذخیرہ روایات سے کوئی ثبوت ہو، یا تمثیل پیش کرسکے، تو اس پر انگلی اٹھانا مناسب نہیں ہے۔

عقلی اعتبار سے اس یقین واطمینان اور اندرونی طور پر کئے ہوئے سودا کا کلمۂ توحید کے ذریعے اقرار واظہار کے بعد اب یہ شخص عمل کے میدان میں اترتے وقت شہادت کا کلمہ پڑھتا ہے۔ اس وضاحت کیلئے کہ اب میری عملی روش اور میری زندگی کی ہر حرکت وسکون، قول وعمل میرے اس اقرار واظہار کا ثبوت پیش کرے گا۔ اور میں اپنی جان ومال کو اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو اس نفس کے تسلط سے آزاد کراکر اللہ اور رسول کے حوالے کرونگا جو نفس مادی وجود کی نمائندگی کرتا ہے، خواہشات کی وکالت کرتا ہے اور مادی اور عارضی لذائذ کی ترغیب دلاتا ہے۔ اور عقل وشعور کی بنیاد پر دلیل کی روشنی میں اللہ ورسول کی ہدایات کے مطابق اپنے دائرے، حدود اربعہ اور میری اپنی حیثیت کے مطابق اپنے مدار زندگی میں رہ کر مصروف عمل رہونگا۔

۳۷- انسان جب عملی میدان میں اترنے کے بعد رہنمائی کیلئے جب کتاب اللہ سے رجوع کرتا ہے تو اعوذ باللہ پڑھتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ (۱) وہ شے جو جذباتی بنا کر مجھے بھڑکادے اور اپنی حدود وقیود اور میری حیثیت کے مدار سے نکال باہر کرے، یا مجھے اپنے خالق اور اس کی ہدایات سے اور نبی کی سیرت وسنت سے دور لے جائے، اس چیز کے شر وضرر سے اپنی حفاظت کی خاطر اپنے اللہ کو آگے رکھ رہا ہوں اور میں اس کی پیروی کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہوں۔ نہ اس سے آگے نکلوں گا، نہ پیچھے کٹونگا۔ گویا اللہ کو آگے رکھ کر اس کے پیچھے رہنے سے اُس شریر شے کے شر وضرر سے اپنے آپ کو چھپانا مقصود ہے۔ (۲) یا شریر شے کی رفاقت ومعاونت کو چھوڑ کر میں نے اللہ کے پہلو میں زندگی گذارنے اور اس کی معاونت میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ عاذ یعوذ اور لاذ یلوذ دونوں الفاظ کا معنی عربی لغت میں چھپنے کا ہے۔ اور نیز عاذ عربی لغت میں کسی کے پہلو اور معاونت میں رہنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور شیطان یا شاط یشیط سے ہے جس کا معنی بھڑک اٹھنا، یا شطن سے ہے جس کا معنی دور جانے کا ہے۔

اعوذ باللہ کے بعد بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔ بسم اللہ تلاوت کیلئے پڑھی جائے، یا زندگی کے مشاغل میں سے کسی بھی شغل کے شروع میں پڑھی جائے، تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جس اللہ کے ساتھ میں نے سودا کیا ہے اُسی اللہ کی عظمت میرے اس عمل میں مشغول ہونے کا باعث وسبب ہے۔ گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ میرے ایمان اور میرے شغل میں فاصلہ اور تفاوت نہیں ہے بلکہ ایمان ہی کا تقاضا ہے۔ بسم اللہ میں ''ب'' سبب کا اور ''اسم''، بمعنی رفعت وعظمت ہے۔

۳۸- ایمان عقلی یا ایمان بالغیب کے بعد مرحلہ آتا ہے اسلام کا۔ لیکن اسلام بمعنی تسلیم کے۔ یعنی انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے عملاً وہ سب کچھ اللہ کے سپرد کردے، اپنے آپ کو ان سب سے بے دخل کردے۔ اپنے اختیار وخواہش سے ان میں کسی قسم کا تصرف کرنے کا تصور بھی نہ کرے اور اپنی ضرورتوں اور سہولتوں کے حصول اور مشکلات ومصائب سے بچاؤ کے بارے میں اللہ کی ذات پر اعتماد کرے، جس کو توکل کہتے ہیں۔

انسان کی ایمانی زندگی میں سب سے مشکل ترین مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ ایمان وتسلیم سے قبل ''رہنمائی'' نفس کرتا ہے۔ جو ہر قسم کی تحدید اور قید وبند سے آزاد خواہشات کی پیروی کا مسلسل اور کثرت سے احکامات دیتا ہے۔ اور فوری اور مادی لذائذ کی ترغیب دیتا ہے جس کو نفس امارہ کہا جاتا ہے جس کی مثال اس شریر، موٹے تازے بڑے سینگ والے بکرے کی ہے جو ریوڑ کے ساتھ آزاد چراگاہوں، پہاڑوں اور میدانوں میں گھومتا پھرتا اور چرتا ہے، جو کسی کے بندھن کو قبول نہیں کرتا، جو بھی سامنے آئے اس کو سینگ یا ٹکر مارتا ہے۔ یا

اگلے پاؤں اٹھا کر پچھلے پاؤں پر سامنے کھڑا ہو کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس بکرے کو اگر کسی غرض سے گھر پر پالنے کی خاطر کیل پر رسی سے باندھا جائے تو وہ چند دن سخت شور مچاتا ہے۔ نہ پانی پیتا ہے، نہ گھاس کھاتا ہے، بلکہ اس کے کودنے اچھلنے سے رسہ بھی اس کے گلے میں پھندا بن جاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ عادی ہوتے ہوتے اس قدر گھر سے مانوس ہوجاتا ہے کہ اگر رسہ کھول کر گھر کے دروازے سے باہر بھی دھکیلا جائے تب بھی وہ گھر کے اندر جانے کا زور لگاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان ایمان وتسلیم کے بعد اپنے نفس امارہ کو اللہ کی کتاب کی کیل پر نبی ﷺ کی سیرت اور سنت کی رسی سے باندھ لے تو وہ کچھ عرصہ کیلئے شور مچاتا ہے: کیا فائدہ؟ لوگ دنیا کماتے ہیں، تم کیا کرتے ہو؟ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے، تمہیں اس طرز زندگی کا کیا فائدہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران اس کو نفس لوامہ (یعنی ملامت کرنے والا) کہتے ہیں۔ ایمان وتسلیم کی زندگی کا یہ مرحلہ مشکل ترین اس لیے ہے کہ اندر سے انسان کو اپنا نفس پریشان کرتا رہتا ہے اور باہر کا ماحول (معاشرہ) اور لوگ اس پر دیانت وامانت کا اعتماد نہیں کرتے۔ اور اس کو اندر اور باہر ہر طرف سے تنہائی ہی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔

لیکن ہر وہ شخص جو ہر قسم کی مشکلات وپریشانیوں کو صبر واستقامت سے برداشت کرتا رہے اور ایمان وتسلیم (صلوٰۃ وزکوٰۃ) یعنی: اللہ کی شرعی ہدایات اور نبی کی سیرت وسنت کے مطابق اللہ کی تعظیم واطاعت، اور مخلوق کو اپنے دل، سوچ، منصوبوں اور زبان وہاتھ کے ضرر سے بچانے اور ہمدردی کی بنیاد پر معاونت کا عمل جاری رکھے، تو مختلف تجربات سے گذرتے ہوئے ایسے حالات سے بھی اس کو واسطہ پڑے گا کہ بظاہر وہ سمجھے گا کہ بس میں تو گیا، تباہ وبرباد ہوا، بے یار ومددگار، بے آسرا وبے سہارا اپنے آپ کو محسوس کرے گا۔ مگر یکایک حالات ایسے پلٹ جائینگے کہ ناکامی کامیابی اور پریشانی خوشحالی سے اور تنہائی حمایت سے بدل جائیگی، تب اس کے دل پر یقین کا سفید نقطہ پیدا ہوگا کہ ہاں! جہاں دلیل کے میدان میں ایمان وتسلیم کی حقانیت وافادیت ثابت ہے۔ اب تجربہ سے عمل کے میدان میں بھی اس کی حقانیت وافادیت ثابت ہوئی۔ لہٰذا دلیل کے میدان میں عقل کے اطمینان کے ساتھ ساتھ تجربہ اور عمل کے میدان میں نفس کے اطمینان کا عمل بھی شروع ہوجائیگا اور مختلف تجربات سے گذرتے ہوئے اور ان تجربات کے مثبت نتائج سامنے آنے کے ساتھ نفس بھی ایمان واسلام کے اس عمل کی افادیت پر کامل بھروسہ اور اعتماد کر جائے گا۔

۳۹- اور اگر کسی وقت بھول سے کسی بھی سنت یا ادب کی خلاف ورزی انسان سے سرزد ہو، تو توجہ دلاتی ہے کہ نقصان کررہے ہو۔ ایسی صورت میں نفس کو نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے، اور ایمان کو ایمان طبعی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان و اسلام کے عمل کو نفس وطبیعت قبول کر کے اس پر مطمئن ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایمان عقلی کے بعد جب اسلام بمعنی تسلیم یعنی اللہ و رسول کو سب کچھ سپرد کرنا اور اپنی مرضی اور اختیار کو اپنی تمام ذاتی صلاحیتوں اور مادی وسائل سے مطلق سلب اور بے دخل کرنا اور اسلام بمعنی سَلَم یعنی مخلوق کو ہر طرح کا امن دینے اور اس طرزِ عمل پر ہر قسم کے نامساعد حالات میں صبر و استقامت کے ساتھ قائم و دائم رہنے کی روش کے بعد ایمان: ایمان عقلی کے ساتھ ساتھ ایمان طبعی بھی بن جاتا ہے۔ نفس کے اطمینان کے بعد طبیعت میں سکون و سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آس پاس کے لوگوں اور ماحول میں اس کی ذات و کردار اور رہنمائی پر اعتماد پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ دور رہنے کے بجائے قریب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کا مومن لوگوں کے لئے فکر وعمل کے میدان میں رہنمائی لینے کا مرجع بن جاتا ہے۔ اس کی صاف ستھری اور نکھری ہوئی شخصیت ان کے سامنے آجاتی ہے کہ اگر وہ اس کی شخصیت کے آئینے میں اپنے کردار کی خامیوں، خرابیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی دعوت، کردار اور شخصیت اسلام کے لئے نمونہ، دلیل اور حجت قرار پا جاتا ہے۔ اس کے دیکھنے سے اللہ یاد آتا ہے۔ لوگوں پر اس کی شخصیت اللہ جل جلالہ کی دلیل اور حجت بن جاتی ہے۔ بایں معنی کہ ان کی بے راہ روی نہ تو جہالت کی وجہ سے تھی اور نہ ہی یہ ان کی بے بسی تھی۔ بلکہ نری بغاوت اور سرکشی تھی جس کا اب انہیں مزہ چکھنا ہوگا۔ کیونکہ اس مثالی شخصیت نے انہیں سمجھانے کے ساتھ ساتھ عمل کر کے قابل عمل نمونہ دکھا بھی دیا تھا۔ جبکہ اس کی صلاحیتیں، ماحول اور زمانہ انہی جیسا تھا۔ اگر یہ شخص الٰہی تعلیمات اور نبیؐ کی سنت اور سیرت پر عمل کر سکتا تھا تو یہ لوگ بھی ایسا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دیدہ دانستہ، جان بوجھ کر بغاوت و سرکشی کر کے عمل نہیں کیا۔ یہ مثالی مؤمن اور مسلمان جب انفرادی زندگی کے اس امتحانی عمل سے اللہ جل جلالہ کی توفیق اور اس پر مکمل بھروسے کی بدولت کامیابی سے گزر جاتا ہے اور لوگ اس کی خیر خواہی، بصیرت و دانائی اور معقول اور مفید رہبری پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہوئے زندگی کے سفر میں اس کو آگے آگے رکھ کر اور خود پیچھے رہ کر اس کے نقش قدم پر اس کے راستے پر اس کی پیروی میں زندگی گزارنا اپنے لئے دنیا و آخرت کی کامیابی اور سعادت سمجھنے لگیں اور اس پر کامل اور پختہ یقین رکھتے ہوئے اس کی رفاقت اور ہدایت و رہبری پر جان و مال کی ہر قسم کی قربانی کے لئے ہمہ وقت ہر حالت

میں دل و جان سے تیار و آمادہ رہنے لگیں، تو ایسی صورت میں اس شخص کی امامت کا آغاز ہو جاتا ہے، اور رہبر بمعہ متبعین کی زندگی انفرادی زندگی کے اصلاحی عمل کے ساتھ ساتھ اجتماعی اصلاحی عمل میں بھی داخل ہو جاتی ہے کیونکہ شرعی تعلیمات کے مطابق اجتماعی زندگی کی ابتدا نصب امام (یعنی اپنے رہبر کے تعین) سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کی یہ امامت امامت خاصہ ہوگی۔ یعنی ایسی صورت میں یہ شخص امام ہوگا، مگر ایک خاص جماعت کا اور خاص علاقے یا خطے کا۔ اور اس امام اور اس کے پیروکاروں کا مقام، مقامِ دعوت و سیاست ہوگا، نہ کہ مقام حکومت۔ اگلے مرحلے میں اور اس کے متبعین کے امتحان کا دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جو اجتماعی زندگی کے امتحان کا مرحلہ ہے۔ جماعت چونکہ ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے جس سے تعبیر فرد اعتباری سے کیا جاتا ہے، لہٰذا آزمائش کے اس مرحلے میں بھی انہی مشکلات و حالات کا سامنا ہوگا جو انفرادی زندگی کے آزمائشی مرحلے میں پیش آئے تھے۔

۴۰- کسی علاقے، خطے یا مملکت کی حاکمیت پر مسلط طاغوت (یعنی وہ سرکش قوت جو کسی قسم کی اخلاقی بندھن اور قانونی حدود کو نہ قبول کرے اور نہ ہی ان کی پاسداری و پابندی کرے بلکہ اپنی آزاد خواہش پر عمل درآمد کرے) اور وہ قوتیں جن کا لوگوں میں مقام، حیثیت، عزت اور مادی و مالی مفادات اس طاغوت سے وابستہ ہوں، خواہ وہ علم و تقویٰ اور پیری و مرشدی کے لبادے میں ہوں، یا سردار، سرمایہ دار، صنعتکار اور جاگیردار کی شکل میں ہوں، سب کے سب اس جماعت کی عداوت پر متفق اور متحد ہو کر اپنے اپنے انداز میں اس سے نفرت پھیلانے، اس پر عداوت کا اپنا غصہ نکالنے کے لئے مختلف طور طریقے استعمال کریں گے تا کہ یا تو ان کو مایوس کیا جائے یا جذباتی بنایا دیا جائے۔ دونوں صورتوں میں امکان ہے کہ جماعت اعتدال کی روش چھوڑ کر اپنی حدود سے نکل کر انتشار و افتراق کا شکار ہو کر خود بخود نیست و نابود ہو جائے گی۔ گویا کہ اجتماعی زندگی کا یہ طاغوت انفرادی زندگی کا نفس امارہ ہے اور اس کا وہی علاج ہے جو انفرادی زندگی میں نفس امارہ کا تھا۔ لہٰذا طاغوت کا پہلا ردعمل اس جماعت کے خلاف توہین و تذلیل کا ہوگا تا کہ اس سے وابستہ افراد خود مایوس ہوں اور لوگ ان کے قریب نہ آئیں۔

۴۱- لیکن جب امام بمعہ متبعین خیر خواہی کے جذبے سے بصیرت کی روشنی میں نبی کے طریقے پر حکمت اور موعظہ حسنہ سے طاغوت کی ظلم و زیادتی، بے انصافی اور بے راہ روی کی نشاندہی کرتے ہوئے اور اصلاح کے لئے مناسب حال اور موزوں و معقول تجاویز کی رغبت دلاتے ہوئے، طاغوت کی غلط کاریوں سے برأت کا اظہار و اعلان کرتے ہوئے، اپنے موقف، دعوت اور برأت پر دلجمعی و استقامت سے قائم اور دائم رہتے ہوئے، حالات کا مقابلہ صبر و برداشت سے کرتے رہیں گے۔ تو دوسرے مرحلے میں اب طاغوت، خوف میں مبتلا کرنے اور لالچ دلانے کا حربہ استعمال کرے گا۔ ظاہر ہے کہ صحیح طرز زندگی کے ابتدائی مراحل میں دو مشکل گھاٹیاں ہوئی ہیں جن کا سر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ (۱) فقر و فاقہ۔ (۲) جان، مال اور آبرو وغیرہ کو لاحق خطرات۔ تاہم جب طاغوت کا حربہ بھی کارآمد ثابت نہ ہو تو اذیت پہنچانے پر اتر آتا ہے۔ دوسری طرف لوگوں میں امام اور اس کے متبعین کا لوگوں میں تعارف، تجربے کے نتیجے میں، اس طرح سے تشکیل پا جاتا ہے کہ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ گروہ ایسا ہے کہ خیر خواہی اس سے متعلق افراد کی طبیعت بن چکی ہے کوئی ان کے ساتھ کچھ بھی کرے لیکن یہ لوگ پھر بھی پرامن رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ہر قسم کے ظلم و زیادتی کو صبر سے برداشت کرتے ہیں اور کسی قسم کا ردعمل اس کے خلاف نہیں دکھاتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ان کے ساتھ قربت کا کسی قسم کا رشتہ توڑے تب بھی یہ لوگ اس کے ساتھ انسانی اخوت اور اس کے لئے خیر خواہی کا رشتہ جوڑے رکھنے کا تسلسل جاری رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرے تو بھی اس سے مسلسل عفو و درگزر کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی توہین و تذلیل کرے، تب بھی یہ لوگ اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کے ساتھ برا بھی کیا ہو تب بھی نوبت آنے پر یہ لوگ اس کے ساتھ اچھائی کرنے کا شیوہ نہیں چھوڑتے لہٰذا لوگوں کی نظر میں ایسے لوگوں کو اذیت پہنچانا خبث باطن کی علامت اور بلا جواز ظلم قرار دیا جاتا ہے۔

۴۲- نتیجتاً لوگوں میں طاغوت سے نفرت و بیزاری میں شدت بھی آنا شروع ہو جاتی ہے اور عوام میں اس نفرت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونا بھی شروع ہو جاتا ہے اور جماعت اور اس کے رہبر کے ساتھ عوامی ہمدردی میں وسعت آنے اور رفاقت میں مضبوطی اور قوت آنے کے ساتھ ساتھ عوام میں ایسی جماعت کا دائرہ اثر ونفوذ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اسی رہبر کی رہنمائی میں ملک کی عوام اور طاغوت کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے کیونکہ طاغوت کے لئے اس سے عوامی بیزاری اور امام اور اس کی جماعت کے ساتھ عوام کی ہمدردی اور رفاقت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ لہٰذا طاغوت کے ظلم و جبر میں بھی شدت اور وسعت آ جاتی ہے۔ لیکن رہبر اور اس کے متبعین کی طرف سے صبر و استقامت کے ساتھ ظلم و جبر کو سہتے ہوئے اپنے موقف پر قائم رہ کر اپنی دعوت کو آگے بڑھانے اور طاغوت سے بیزاری کے اظہار واعلان کو تسلسل سے جاری رکھنے کے باعث یہ صورتحال پیدا ہو جائے گی کہ اب طاغوت کا سامنا صرف رہبر اور اس کی جماعت سے نہیں ہوگا، بلکہ اب مقابلہ عوام اور طاغوت کے درمیان ہوگا۔ البتہ عوام کی رہبری جماعت اور اس کا امام کرینگے جبکہ طاغوت دن بدن تنہا ہوتا جائے گا۔ اب طاغوت کو اپنی تنہائی کا احساس ہونے کے ساتھ روز بروز اس احساس میں شدت اور قوت آتی جائے گی اور بالآخر تنہائی کے شدت احساس سے وہ دل ہار کر عوام کے مقابلے میں شکست کھا کر اپنی جان بچانے کے درپے ہوگا۔ ایسی صورت میں اداراتی نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ معاشرہ کو دوبارہ منظم کرنے کا انحصار امام اور اس کے متبعین کی صلاحیت، اور جدوجہد اور ان کی مستعدی پر ہوگا۔ جب دوبارہ نظم بحال ہو، تو پہلا کام جو کرنے کا ہے، وہ عوامی رائے (ریفرنڈم) کے ذریعے سے نظام اور امام کا تعین ہے، جب ریفرنڈم کا نتیجہ اسی رہبر کی امامت اور دعوت کے حق میں ہو، تو اب اس کے بعد یہ رہبر امامت خاصہ یعنی مخصوص جماعت کی امامت سے امامت عامہ (یعنی اس ملک کے تمام عوام و باشندگان) کی امامت کا حامل قرار پائے گا اور چونکہ عوامی مرضی سے اس کو قوت حاکمیت بھی حاصل ہوئی، اس لئے اب وہ مقام دعوت کے ساتھ ساتھ خلافت کے منصب کا بھی حامل ہوگا۔ خلافت کا معنی خلیفۃ اللہ، یعنی اللہ جل جلالہ ہدایت و رزق کی عطا اور تقسیم سے متعلق اپنے عمل کو اس کے ذریعے پورا فرمائیں گے یا خلیفۃ الرسول، بایں معنی کہ دعوت یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس کے مطابق کردار دکھانے کا عمل جو رسولؐ کی وراثت ہے، وہ یہ جاری رکھے گا۔ یا پھر ایسا امام خلیفۃ المسلمین کہلائے گا،، بایں معنی کہ فروض کفایہ مثلاً حدود و قصاص و جہاد وغیرہ میں یہ مملکت کے مسلمانوں کا نائب اور قائم مقام ہوگا۔ اسی لئے حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ اللہ کے نام سے پکارے گئے مگر انہوں نے اپنے لئے خلیفۃ الرسول کا لقب پسند کیا۔

۴۳- یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ ہر وہ شخص جو انسانوں کی کسی جماعت کا سربراہ خلیفہ کے حکم سے مقرر ہو، تو اس کو امیر کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے ان کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے حاکم و سربراہ مقرر ہوئے تھے، اس لئے ان کو امیر المومنین کہا جاتا رہا اور خلیفۃ المسلمین بھی۔ دوسری طرف جب کوئی فرد قوت کے بل بوتے پر حاکمیت پر قبضہ کرے مگر قوت و اقتدار کو شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے تو اس کو سلطان کہتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے خلیفۃ وقت حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار کیا اور ان کی خلافت سے نکل کر خود اپنی آزاد حکومت کے لئے قوت کا استعمال کیا اس لئے ان کو سلطان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کو امیر بھی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ حضرت عمرؓ کے حکم سے شام کے گورنر (والی) مقرر ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ نے ان کو برقرار رکھا اور حضرت علیؓ کے ساتھ تحکیم کے نتیجے میں اور حضرت حسنؓ کے ساتھ مصالحت کی وجہ سے ان کو خلیفہ بھی کہتے ہیں۔ تاہم جب کوئی شخص قوت کے راستے سے اقتدار پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ قوت و اقتدار کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرے، جی نے چاہا یا اپنی غرض کے لئے مفید پایا، تو شریعت پر عمل کیا ورنہ اپنی خواہش پر چلا، اور اگر شریعت کو توڑ مروڑ کر اپنی خواہش کے لئے استعمال کرنے کا امکان ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرے، تو ایسے حاکم کو ملک کہتے ہیں اس لئے کہ وہ عوام پر ایسی حکمرانی کرتا ہے جیسا کہ مالک اپنے مال میں اپنی مرضی کا تصرف کرتا ہے۔

۴۴- مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسانیت میں ہر سطح پر وحدت ہے، رنگ ونسل کی بنا پر اس وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور ایک دوسرے کے مقابلے کے لئے آمنے سامنے لا کھڑا کرنا نہ انسانیت کے لئے مفید ہے اور نہ ہی معقول ہے، مفید اس لئے نہیں کہ ایسی صورت میں نفرتیں پیدا کرنی پڑیں گی ان کو فروغ دینا ہوگا، نوبت تصادم تک پہنچے گی، انسانی خون بہے گا، گردنیں کٹیں گی، عزتیں لٹیں گی، آبادیاں اجڑیں گی اور خیرخواہی کے اس انسانی جذبے، محبت اور طلب کا خون ہوگا جو ہر فرد بشر میں موجود ہے یعنی خالق، انبیاء، اور مخلوقات کی اور بالخصوص اپنی ذات کی خیرخواہی کا جذبہ۔ صرف اپنی ذات کی خیرخواہی کا جذبہ، اپنی ذات کے ساتھ محبت، اور اپنی حفاظت کی طلب اس لئے معقول نہیں ہے کہ انسانی خاکی جسد کا بنیادی مادہ پوری زمین کی مٹی سے اخذ

کردہ نچوڑ اور خلاصہ ہے، زمین میں سفید، سیاہ، زرد و سرخ وغیرہ رنگوں کی لہریں موجود ہونے کے باوجود زمین ایک ہے اور ایک کہلائی جاتی ہے، نہ رنگت کی وجہ سے زمین میں تعدد پیدا ہوتا ہے نہ تضاد و تصادم۔ اسی طرح زمین سے اخذ کردہ جسد انسانی کی رنگوں کا اختلاف، انسانیت میں تفریق، تضاد اور تصادم کی نہ وجہ بن سکتی ہے اور نہ ہی رنگوں کا یہ اختلاف اس کے لئے بصیرت پر مبنی معقول دلیل گردانا جا سکتا ہے۔

۴۵- نسلی شاخوں اور قبیلوں کی بنیاد پر انسانیت میں نفرت و تفریق، تضاد و تصادم اس لئے بھی معقول نہیں کہ تمام انسان ابتداء میں ایک جڑ سے پھوٹے اور آگے بڑھے اور پھیلے ہیں جب کہ تاریخی روایات میں ہے کہ حوا علیہا السلام بھی آدم علیہ السلام کے پہلو کی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا شخص آدم پوری انسانیت کے لئے جڑ ہے اور ایک جڑ سے تعداد کے لحاظ سے چاہے جتنے بھی تنے اٹھیں اور حجم کے اعتبار سے ان تنوں میں چاہے جتنا بھی فرق ہو، ہر تنے کی جتنی بھی شاخیں ہوں، ہر شاخ میں جتنی بھی ٹہنیاں ہوں، تب بھی اس کو ایک درخت ہی شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی غذا ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس کا ثمر بھی ایک جیسا ہوتا ہے اور اس کی پرورش اور نگرانی بھی ایک جیسی کی جاتی ہے۔ لہٰذا پوری انسانی شاخیں، قبیلے اور افراد ایک ہی جڑ سے پھوٹے ہوئے تنے، شاخیں اور ٹہنیاں ہیں۔ جن کی غذا پرورش اور افادیت و ثمر ایک جیسا ہے۔

۴۶- افکار و نظریات اور آراء و خیالات میں اختلاف کی بناء پر انسانوں میں انتشار و افتراق، تضاد و تصادم اس لیے معقول و مفید نہیں کہ افکار کے میدان میں اختلاف دو قسم کا ہے۔ اول یہ کہ اختلاف اصولوں میں ہو مثلاً:

۱- یونان میں وکیلوں کی ایک جماعت کی طرف سے حق کو ناحق اور ناحق کو حق ثابت کرنے کے عمل کو تسلسل سے جاری رکھنے کے نتیجے میں ان کے دل و دماغ پر ایک خبط طاری ہوا کہ حقیقت و حقائق نام کی کوئی شے ثابت و موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے یہ سب بلاحقیقت محض سراب ہے۔ علماء نے ان کا نام سوفسطائیہ رکھا ہے اور ان کے طرز استدلال کو سفسفہ کا نام دیا ہے۔ یعنی یہ لوگ خود بھی مغالطے کے شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطے کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔

۲- دوسرا طبقہ وہ ہے جو حقائق کو ثابت و موجود مانتے ہیں۔ عالم کو قدیم و ازلی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عالم کی کوئی ابتداء نہیں اور نہ ہی عالم کا کوئی خالق و مدبر ہے۔ علت و معلول کا ایک تسلسل ہے اور میکانکی طور پر خلق اور فنا کا عمل جاری ہے۔ اس طبقے کو دہریہ کہا جاتا ہے۔

۳- تیسرا طبقہ وہ ہے جو حقائق کو ثابت اور عالم کو قدیم ماننے کے ساتھ ساتھ عالم کا ایک قدیم مدبر بھی مانتے ہیں۔

۴- چوتھا طبقہ وہ ہے جو حقائق کو ثابت مانتے ہیں، مدبرین عالم ایک سے زائد مانتے ہیں اور سب مدبرین عالم کے قدیم ہونے پر ان کا اتفاق ہے، البتہ مدبرین کی تعداد میں ان کے درمیان اختلاف ہے اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ بعض عالم کو قدیم اور بعض محدث مانتے ہیں۔

۵- پانچواں طبقہ وہ ہے جو حقائق کو ثابت، عالم کو محدث، اور عالم کا ایک قدیم واحد خالق اور مدبر مانتے ہیں لیکن نبوت کا انکار کرتے ہیں کہ یہ نہ معقول ہے اور نہ مفید۔

۶- چھٹا طبقہ وہ ہے جو حقائق کو ثابت، عالم کو محدث اور اس کا واحد قدیم خالق و مدبر ماننے کے ساتھ نبوت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ البتہ نبیوں میں تقسیم کرتے ہیں، کچھ کا انکار اور کچھ کو تسلیم کرتے ہیں۔

۷- ان میں سے بعض تناسخ ارواح کے قائل ہیں۔

۸- بعض نبوت کا تمام ازمان و اوقات اور تمام انواع حیوانات میں تسلسل و تواتر سے جاری رہنے کے قائل ہیں۔

۹- بعض خالق کے ساتھ ساتھ، نفس، مکان مطلق، زمان مطلق کے قدیم ہونے کے بھی قائل ہیں۔

اس قسم کے اختلاف کا اصل سبب جہالت ہے اور جہالت انسانی بصیرت میں کمزوری، کوتاہی اور بیماری کا نام ہے۔ اللہ جل جلالہ نے انسان میں محسوس کائنات کے احساس شناخت و معرفت کے لیے جس طرح حواس پیدا کیے ہیں اسی طرح حقائق کے فہم و ادراک کے لیے عقل و وجدان کی بصیرت انسان میں رکھی ہے۔

۴۷- حواس ہو، یا عقل و وجدان اگر وہ خود تندرست و صحتمند نہ ہوں تو علمی میدان میں وہ صحیح رہنمائی کا وسیلہ نہیں بن سکتے۔ مثلاً کسی کی آنکھوں میں بیماری ہو اور اس کو ایک چیز دو نظر آئیں، سیدھی چیز ٹیڑھی نظر آئے۔ صفراء کے غلبے میں کسی کا ذائقہ متاثر ہوا ہو اور اس کو میٹھی چیز کڑوی محسوس ہوتی ہو، تو ایسی صورت میں یہ نہیں مانا جاتا اور نہ کہا جاتا ہے کہ محسوس اشیاء واقعتاً ایک سے دو، سیدھی سے ٹیڑھی اور میٹھی سے کڑوی ہوگئی ہیں بلکہ یہ مانا اور کہا جاتا ہے کہ حاسہ کی بیماری کے باعث ان چیزوں کے بارے میں متاثرہ شخص کا احساس، شناخت، معرفت، علم اور تصور غلط ہے۔

۴۸- اسی طرح اگر عقل و وجدان کی بصیرت، انسانی عقل کی محدودیت اور نارسائی کے باعث اور جہالت کی بیماری اور ظلمت سے متاثر ہو کر حقائق کے فہم و ادراک کے لیے فکر و تدبر اور استدلال و نظر میں کمزوری دکھاتی ہے یا کوتاہیوں، غلطیوں اور انحرافات کا مرتکب ہوتی ہے تو ایسی

صورت میں بھی یہ مانا اور کہا جائے گا کہ فہم و ادراک کے وسیلے کی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے حقائق کے بارے میں فہم و ادراک غلط ہے نہ یہ کہ حقائق کو جھٹلایا جائے گا۔ اب اگر انسانی عقل و وجدان تندرست وصحت مند ہوں اور بصیرت جہالت کی بیماری سے محفوظ ہو تو اصولوں میں صحیح رہنمائی تو کر سکے گی۔ مثلاً خالق، مالک، محسن، رہبر، حاکم وغیرہ کی معرفت وجود ووحدانیت اور اعمال کا حسن و قبح مثلاً امانت میں خیانت، احسان فراموشی (ناشکری) آقا کی تعظیم و اطاعت میں کوتاہی وغیرہ وغیرہ کی قباحت، جیسا کہ تحریر کی ابتداء میں بیان کیا گیا ہے۔ اور احسان مندی، شکر گزاری، امانت صحیح سلامت مالک کو پہنچانا وغیرہ کا حسن۔ لیکن یہ کہ محفوظ اور مفید انسانی زندگی کے لیے روزمرہ اور لحہ بہ لحہ کے معمولات و مشاغل میں کیا کرنا چاہیے اور احسانات اور امانتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے کہ خیانت و ناشکری، بغاوت وخسارے کی تجارت اور زندگی کے سفر پر بے منزل و بے مقصد آوارہ گروی و بے راہ روی کی مشقت سے بچا جا سکے تا کہ جن احکام کو احکام تکلیفی کہا جاتا ہے ان کا کماحقہ اتباع کیا جا سکے۔

۴۹- ان امور و احکام کے صحیح علم کے لیے عقل و وجدان کی بصیرت کی صرف صحت کافی نہیں بلکہ باہر سے وحی کی روشنی کی بھی ضرورت ہے جیسا کہ آنکھوں کی بصارت چاہے جتنی بھی قوی اور محفوظ وتندرست ہو لیکن پھر بھی اس کو باہر کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ گھپ اندھیرے میں قوی، صحتمند آنکھیں بھی بینائی اور اشیاء میں تمیز کا کام نہیں کرتیں یہی حالت بصیرت کی بھی ہے۔

۵۰- ہر انسان میں اپنے آپ کی خیر خواہی کا جذبہ، اپنی ذات سے محبت، اپنی حفاظت وسہولت کی شدید خواہش موجود ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان دوسروں کا خیر خواہ بنے، دوسروں سے محبت رکھے، دوسروں کو اپنی جانب سے حفاظت دے اور ہر طرح کی حفاظت اور سہولت میں دوسروں کا معاون بنے۔ یہی واحد راستہ ہے ہر انسان کے لیے اپنی خیر خواہی کے جذبے کی تکمیل، اپنی ذات سے محبت کے اظہار، اپنی حفاظت کی ضمانت اور اپنی سہولت کے لیے اعانت حاصل کرنے کا۔ بصورت دیگر وہ ہر طرف سے نفرتوں اور عداوتوں کا نشانہ بنے گا۔ بالائی قوتیں توہین و بغاوت کی بناء پر سزا دینے اور مساوی اور ماتحت قوتیں نفرت و عداوت کی بناء پر ضرر پہنچانے کے درپے ہوں گی۔ ایسی صورت میں وہ انسان نہ اپنا خیر خواہ رہا نہ اس نے اپنی ذات سے محبت کی اور نہ اپنی حفاظت اور سہولت کا راستہ اختیار کیا۔ اب اگر ایک شخص باہر سے رہنمائی لیے بغیر سطحی طور پر اپنی حفاظت اور خیر خواہی کو تلاش کرتا ہے تو اس کی نظر ظاہری اور مادی کائنات پر پڑے گی تو جن چیزوں کو اپنی استطاعت سے باہر اور طاقتور اور عظیم سمجھے گا تو ان کی عظمت کے احساس سے یا خوف کے مارے ان کے سامنے سربسجود رہے گا تا کہ خوف کی صورت میں ان کی ضرر سے بچا جا سکے۔ یا عظمت کے احساس کی صورت میں ان کے آداب بجا لائے جا سکیں اور اگر کسی چیز سے اپنا کوئی مفاد وابستہ دیکھے تو لالچ اور شکر گزاری کی خاطر اس کا احترام و تعظیم کرے گا اور ان چیزوں کو وہ مافوق الفطرت اور ماوراء الطبیعت قوتوں اور روحوں کا حامل سمجھے گا اور ان روحوں کی مادی شبیہ سامنے رکھ کر ان کی عبادت کریگا۔ اور اگر کسی کو اپنے سے کم درجے کا پائے گا اور اپنے آپ کو اس کی نسبت سے قوی اور اس پر غالب اور بالادست سمجھے گا تو اس پر شیخی جتائے گا تا کہ اس کی اپنی انا اور خود پسندی کی تسکین ہو۔ اس کا استحصال کرے گا تا کہ اس کی اپنی خود غرضی، مفاد پرستی اور زیادہ سے زیادہ مال اور مادی وسائل جمع کرنے کی ہوس کو پورا کرے اور پھر ان اموال کے گننے اور دیکھنے سے لذت اور سکون حاصل کرے اور دوسروں پر برتری ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ ایسے میں انسان اپنے نارسا فہم و فراست سے سمجھے گا کہ اس سب کچھ میں میری خیر ہے اور یہی میری اپنی ذات کی خیر خواہی کا تقاضا ہے جس سے میں اپنی ذات کو محفوظ اور مفید بنا سکتا ہوں۔

۵۱- یہ تو وہ لوگ ہوں گے جو کسی نہ کسی شکل میں مادہ کے ساتھ روح کے قائل ہیں لیکن جو لوگ صرف مادہ کے قائل ہیں اور روح کا مطلق انکار کرتے ہیں یا انکار نہ بھی کریں لیکن زندگی کے مشاغل میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے ان کا مطمح نظر تو صرف اقتدار و قوت اور دولت وثروت کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان ذاتی خیر خواہی کی فکر پر متحد و متفق ہونے کے باوجود اپنے نارسا فہم و فراست سے رہنمائی لینے کی صورت میں خود اپنا ہی دشمن رہے گا اور اپنی ہی ہستی کو غیر محفوظ اور غیر مفید بنانے کے درپے ہوگا۔ اگر وہ روح کا انکار کرے یا نظر انداز کرے اور صرف مادہ اور مادی زندگی کو اپنا مقصد حیات قرار دے تو اس کی زندگی حیوانی زندگی ہو گی نہ کہ انسانی زندگی۔ یعنی نفسانی خواہشات کی بغیر قیدو بند اندھی تسکین، قوت و دولت کے حصول کیلئے ہر قسم کے حیلوں، وسیلوں کا بغیر قیدو بند استعمال اور پھر اسی قوت و دولت کو اپنی آزاد خواہش کے مطابق بغیر قیدو بند اندھا استعمال اس کا وطیرہ ہوگا جس سے وہ خالق اور حاکم مطلق کے مجرم بننے کے ساتھ ساتھ مخلوق کی نفرتوں اور عداوتوں کا بھی نشانہ بنے گا۔ لہٰذا ذاتی خیر خواہی کی فکر سے اس کا یہ رویہ جوڑ نہیں کھاتا کیونکہ انسان اپنے اس رویے سے اپنے لیے ہر طرف سے نفرتیں اور عداوتیں پیدا کرتا ہے۔

اپنے اوپر کی قوتوں کی بھی اور دیگر مخلوق کی بھی اور ہر طرف سے اپنے آپ کو نفرتوں اور عداوتوں کا نشانہ بنا کر مطمئن ہونا کہ میں نے اپنے آپ کی خیر خواہی کی، نادانی ہی ہے۔ اور اگر انسان کسی نہ کسی درجے میں روح کا اقرار کرے لیکن مادیت اس پر غالب ہو تو وہ بظاہر فطرت کو آقا اور حاکم سمجھ کر ان کے آگے ہاتھ جوڑے گا اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوگا۔ حالانکہ انسان کائنات کا مخدوم ہے اور کائنات بمعہ مظاہر فطرت اس کے خادم ہیں۔ اگر مخدوم خادم کے سامنے سجدہ ریز ہو تو ایک طرف تو اس نے اس عمل سے اپنے آپ کو ذلیل کیا اور دوسری طرف سے جو مستحق تھا سجدے کا اس کا مجرم بھی بنا۔ یہ بھی نہ دانائی ہے اور نہ اپنی خیر خواہی ہے۔

۵۲- یا پھر انسان مادہ کا انکار کرے گا، صرف روح کا اقرار کرے گا یا عمل کے میدان میں مادہ کو نظر انداز کر کے فقط روحانیت کی جانب میلان رکھے گا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے وہ فرشتہ صفت بنے لیکن پھر بھی اس کی زندگی انسانی زندگی نہیں کہلائے گی اور نہ ہی انسانی زندگی کی افادیت کی حامل ہوگی غرضیکہ انسان مادہ کو ترجیح دے اور اس کی جانب لگ جائے اور روح کا انکار کرے یا اسے نظر انداز کرے اور یا پھر روح کی جانب لگ جائے اور مادہ کا انکار کرے یا اسے نظر انداز کرے دونوں صورتوں میں نہ تو اس کی زندگی انسانی زندگی ہوگی اور نہ ہی وہ اس افادیت کا حامل انسان ہوگا جس کے لیے اس کی تخلیق کی گئی۔ نہ ہی جہالت و نادانی کی اس تاریکی میں وہ اپنا خیر خواہ ہو سکتا ہے جب تک انسان اس خالق کی رہنمائی حاصل نہ کرے جس نے بے حس مادہ اور روح کے درمیان معتدل اور حسین امتزاج پیدا کر کے کائنات و عالم اور انسان کو پیدا کیا ہے۔ اسی کی رہنمائی ہی سے یہ ممکن ہو سکے گا کہ کسی ایک جانب میلان کیے بغیر مادہ اور روح دونوں کو صراط مستقیم پر اعتدال کے ساتھ برتا جائے۔ اسی صراط مستقیم پر چلتے ہوئے عبادات سے روحانیت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکے گا اور معاملات میں مادیت کے ساتھ ساتھ روحانی رابطے اور صحت کو بھی برقرار رکھا جاسکے گا۔ لہٰذا جہالت و نادانی کی اس بیماری اور تاریکی سے انسانیت کو نکالنے کا راستہ نفرت، عداوت اور بیزاری، انتشار و افتراق اور تصادم نہیں ہے۔ بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے بصیرت کی روشنی میں نبوت کے طریقے پر معقول دلیل سے ہمدردی، شفقت و محبت بھرے لہجے سے جاذب اور دل نشین طرز گفتگو سے اور موقع اور محل کی مناسبت سے اچھے اعمال کے مفید نتائج اور برے اعمال کے تباہ کن عواقب سے آگاہی دلانا اور اچھائی کی ترغیب دلا کر اس کا امر کرنا ہے۔ اور برائی سے ڈرا کر نفرت دلا کر منع (نہی) کرنا تا کہ نتیجتاً مخاطب دل نرم ہو کر اپنی ذات کی خیر خواہی اور اپنی حفاظت کی خاطر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے از خود اوامر پر عمل پیرا ہو اور نواہی سے اجتناب کرنے لگ جائے۔ اس کو کہتے ہیں دعوت علی وجہ البصیرۃ علی نہج النبوۃ بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنہ۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ترغیب و ترہیب اور بالفاظ دیگر سیاست بھی کہتے ہیں۔

۵۳- ایک داعی کی حیثیت غلط کاروں کے لیے ایک ماہر شفیق معالج کی ہے۔ مرض سے تو اس کو نفرت ہوتی ہے مگر مریض کے ساتھ اس کو شفقت ہوتی ہے اور وہ شدید خواہش رکھتا ہے کہ مریض صحت یاب ہو اور پرہیز و دوا کی سختی سے پابندی کرے مگر اس شدید خواہش کے باوجود مریض کی بے قاعدگیوں پر مریض کو جھڑکتا ہے اور نہ ہی اس پر ہاتھ اٹھاتا ہے اور نہ ہی اس کے دل میں مریض کو دوا یا پرہیز کے میلان میں یا کسی اور طرح کا گزند پہنچانے کا کوئی جذبہ پروان چڑھتا ہے بلکہ مریض کی نادانی اور بے وقوفی کی وجہ سے اس کی خیر خواہی کے جذبہ میں اور بھی شدت آتی ہے اور اس کو اور بھی نرمی اور شفقت سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے عین اسی طرح جس طرح شفیق والدین اولاد کی ہر قسم کی شوخی کے باوجود نہایت پیار و محبت سے سنبھالنے اور سمجھانے کی جدوجہد کرتے ہیں لہٰذا ایک داعی سیاسی شخصیت کا بھی انہی جذبوں اور رویوں کا حامل ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اگر داعی ان جذبوں، رویوں اور صفات کا حامل ہوگا تب ہی وہ انسانیت کی رہبری اور خیر خواہی کا حق ادا کر سکے گا اور اپنے فرائض باحسن طریق ادا کرنے کے باعث اپنا بھی خیر خواہ بن سکے گا۔